© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم ؕ

اشارات

عربی زبان کا ایک مشہور شعر ہے:

السعید من اعتبر بغیرہ

الشقی من اعتبر بہ غیرہ

یعنی خوش نصیب ہے وہ جو دوسروں سے عبرت پکڑتا ہے اور بدنصیب ہے وہ جو دوسروں کے لیے سامانِ عبرت بنتا ہے۔

انسانیت اس وقت جس دور سے گزر رہی ہے وہ تاریخ کا بڑا المناک دور ہے۔ اِس دور میں انسان وقت کی سب سے غالب تہذیب کا حشر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ مادّہ پرستانہ نقطۂ نظر فکر و نگاہ کی جن تاریکیوں کو جنم دے سکتا تھا اُس نے دے دیا ہے اور فعل و عمل کی جس قدر بُرائیاں وجود میں آسکتی تھیں وہ پوری طرح آچکی ہیں۔ اس تہذیب کے کسی گوشے کے بارے میں اب ابہام باقی نہیں رہا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس تمدّن کی چکا چوند روشنی نے بیشتر انسانوں کی آنکھوں کو اس حد تک خیرہ کر دیا ہے کہ انہیں بربادی کے آثار نظر نہیں آتے اور وہ انسانی ضمیر، ایمان، اخلاق کے کھنڈرات کو آزادی اور روشن خیالی کی سر بفلک عمارات سمجھ رہے ہیں۔

یہ صورتِ حال اتنی افسوسناک ہے کہ اس پر جس قدر بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ کسی قوم، کسی گروہ یا طبقے کا دنیا میں سامانِ عبرت بن جانا کوئی ایسی چیز نہیں جس پر کوئی فرد خوش ہو سکتا ہو، ایک فرد کی تباہی سے جب دوسرے افراد متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تو قوموں کی بربادی کے ہولناک نتائج سے انسانیت کا کوئی طبقہ کس طرح محفوظ رہ سکتا ہے۔ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنَا مِمَّنْ یَعْتَبِرُ الدُّنْیَا وَلَا یَعْبُرُھَا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس ضمن میں یہ بات ذہن نشین رہے کہ کسی فرد یا گروہ کی ہر ناکامی یا تھوڑی بہت تکلیف کو باری تعالیٰ انسانوں کے لیے عبرت نہیں بناتا بلکہ اس کی پیہم غلط کاریوں اور بداعمالیوں کی بنا پر اُسے ایک ایسے دردناک انجام تک پہنچا دیتا ہے کہ تھوڑی سی بصیرت رکھنے والا آدمی بھی اُسے دیکھ کر گہرا اثر قبول کرتا ہے اور اُس راہ پر جانے سے گریز کرتا ہے جس پر چل کر وہ بدنصیب انسان یا گروہ اس انجام کو پہنچا ہے۔ اَلعِبرَہ درحقیقت اُس حالت کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ کسی محسوس چیز کی وساطت سے اَن دیکھے نتائج تک پہنچا جائے۔ قرآن میں ہے: اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَعِبْرَۃً۔ اس واقعہ میں بڑی عبرت ہے یعنی اسے دیکھنے سے انسان اُس ہولناک انجام کا بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے جس پر یہ واقعہ منتج ہوا ہے۔ قرآن مجید نے گزشتہ اقوام کی گمراہیوں اور کوتاہیوں اور اُن کے تشویشناک نتائج کا بار بار ذکر کر کے انسانوں کو اس بات کا حکم دیا ہے کہ وہ اس سے عبرت حاصل کریں۔ یعنی اُن کی بربادیوں کے تذکرے ان کی آنکھیں کھولنے کے موجب بنیں اور وہ ان گمراہ قوموں کی پیروی سے دامن بچا کر آگے بڑھنے کی کوشش کریں تاکہ وہ اُس عبرتناک انجام سے محفوظ رہیں جس تک گزشتہ قومیں پہنچی ہیں۔

یُوں تو وہ ساری قومیں جو مغربی تہذیب کی لپیٹ میں ابھی تک پُوری طرح نہیں آئیں، مغرب کی صورتِ حال سے عبرت حاصل کر سکتی ہیں مگر مسلمان کے لیے یہ ایک نہایت نازک مرحلہ ہے کہ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی صحیح فیصلہ کریں۔ وہ مغربی تہذیب کے سمندر میں کود چکی ہیں اور بڑی تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہیں مگر ان میں سے اکثر و بیشتر اُس ریلے کی زد سے ابھی تک محفوظ ہیں جس میں بہ نکلنے کے بعد ان کا پلٹنا غیر ممکن ہو جائے اور تباہی و بربادی اُن کا ناگزیر انجام بن کر دوسروں کے لیے عبرت کا سامان فراہم کرے اور انسانیت کے آنے والے قافلے جب ان کی بستیوں سے گزریں تو وہ زبان سے یہ کہیں:

کَانَ عَاقِبَۃَ الَّذِیْنَ اَسَاۗءُوا السُّوْۗ آٰی اَنْ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَکَانُوْا بِہَا یَسْتَہْزِءُوْنَ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مغربی قومیں اگرچہ زندگی کے ہر شعبے میں بڑے حسرتناک انجام کی طرف جارہی ہیں مگر خصوصیت کے ساتھ اُن کے اخلاق جس طرح تباہ ہوتے ہیں وہ سب سے زیادہ تشویشناک داستان ہے۔ چونکہ ہمارے ہاں سب سے زیادہ تقلید ان کی اخلاقی بے راہ روی ہی کی جارہی ہے اور یہ سلسلہ بڑی تیزی سے شروع ہو چکا ہے اس لیے ہم ان صفحات میں اپنی معروضات صرف مغرب کی اخلاقی حالت تک محدود رکھیں گے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ یہ "فلسفہ آزادی" عملی زندگی میں کس قسم کی پیچیدگیاں پیدا کرتا ہے اور قوموں کو کن مصائب میں مبتلا کرتا ہے۔ مگر ان گزارشات سے پیشتر ہم ایک دو باتیں کہنا ضروری سمجھتے ہیں۔

مسلمانوں کو یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ جو قومیں کسی نظریہ کو اپنا کر اس کے لحاظ سے ایک غلط اخلاقی رویہ اختیار کرتی ہیں ان کی حالت اور اس قوم کی حالت میں بڑا فرق ہوتا ہے جو کسی اُن کی نقالی میں اس رویہ کو اختیار کر لیتی ہے درآنحالیکہ اس کا اخلاقی فلسفہ اور عقیدہ اسے بداخلاقی سمجھتا ہے۔ کسی نظریہ پر صدق دل سے یقین رکھنے والی قوم اگر کسی غلط طرزِ فکر کو اپنا کر بُرے انجام کو پہنچتی ہے تو اُسے برباد ہونے میں بڑی دیر لگتی ہے لیکن نقال قوم یہ مسافت بڑی تیزی کے ساتھ طے کر کے دنیا سے نیست و نابود ہو جاتی ہے اور اس کا انجام اول الذکر قوم کی بہ نسبت کہیں زیادہ عبرتناک ہوتا ہے۔ اس کی وجہ ابن خلدون یہ بیان کرتا ہے کہ غلط نظریہ کو دل و جان سے اپنانے والی قوم بہر حال اپنے سامنے زندگی کا ایک واضح نصب العین اور اس نصب العین کے حصول کے لیے سچا جذبہ رکھنے کی وجہ سے اپنے اندر تعمیری صلاحیتوں کو اُبھارتی ہے اور پھر انہیں ایک سلیقے کے ساتھ ایک راہ پر لگاتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اس کے لیے اُسے غیر معمولی ایثار اور تدبّر سے کام لینا پڑتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُس قوم کے اندر ایک خاص نوعیت کا نظم و ضبط پیدا ہو جاتا ہے۔ قوموں کا تو ذکر ہی کیا ہم اپنی روزمرہ زندگی میں بھی یہ دیکھتے ہیں کہ جو لوگ چوری اور ڈاکہ زنی کی غرض سے بھی اکٹھے ہوتے ہیں وہ اپنے اندر ایثار، جذبۂ تعاون، جرأت اور ڈسپلن جیسی قیمتی صفات پیدا کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں اور انہیں پیدا کیے بغیر اُن کی گاڑی ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔

بخلاف اس کے وہ افراد یا قومیں جو کسی غلط نظریۂ حیات کو غلط جانتے ہوئے صدقِ دل سے اسے اختیار نہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرتیں بلکہ محض نقالی میں اس پر چل پڑتی ہیں ان کا حشر "غلط کار مگر مخلص" قوموں کی بہ نسبت بہت بُرا ہوتا ہے کیونکہ یہ قومیں کسی نصب العین سے سچی محبت اور مخلصانہ وابستگی کے فقدان کی وجہ سے اپنے اندر کوئی تعمیری رجحان اور صلاحیت تو پیدا نہیں کر سکتیں اور اپنی ساری قوتیں اُن کاموں میں صرف کرتی ہیں جو کسی ایثار اور قربانی کے طالب نہ ہوں۔ کسی محنت کے بغیر انہیں زیادہ سے زیادہ تن آسانیاں فراہم کر سکیں۔ ظاہر بات ہے یہ کام گھٹیا اور آسان قسم کی نقالیوں کے سوا اور کونسے ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ نقالی کا شیوہ اختیار کرنے والی قومیں دوسری قوموں کی برائیوں اور کمزوریوں کے سوا اور کوئی چیز اپنا نہیں سکتیں۔

اس بنا پر ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یورپ میں اخلاقی بے راہ روی کا جو طوفان اٹھا ہے اگرچہ وہ بھی بڑا تشویشناک ہے اور انسانیت پر اُس کے اثرات بھی بڑے مہلک ہیں، مگر ان قوموں کی بے مغز نقالی سے ہمارے ہاں یہ طوفان جس شدت کے ساتھ آئے گا اس کی ہلاکت خیزی کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اُن قوموں کو اگر انحطاط کا شکار ہونے میں دو تین سو سال لگے ہیں تو ہم اس بُرے انجام کو نصف صدی سے بھی پیشتر پہنچ جائیں گے۔ مغربی قوموں نے بہر حال سائنسی اکتشافات کی سر بفلک چوٹیوں کو سر کیا ہے اور اس وجہ سے انہیں محنت و مشقت اور ضبطِ نفس کی اچھی خاصی مشق ہو گئی ہے جو ان کے اس دورِ انحطاط میں بھی انہیں جینے کا حوصلہ اور تدبر عطا کر رہی ہے مگر ہماری قوم جسے اس مادہ پرستانہ تہذیب کی تعمیر میں کوئی محنت اور قربانی صرف نہیں کرنی پڑی ہے، اور جس نے محض اپنی حماقت سے اس تہذیب کے صرف چمک دار اور خوش منظر اور لذت بخش پہلوؤں کو ہی علاماتِ ترقی سمجھ کر اپنا لیا ہے، وہ بلا روک ٹوک انحطاط اور تنزل کے مُہیب غاروں کی طرف لڑھکتی چلی جائے گی اور غیر معمولی عجلت کے ساتھ حسرتناک انجام سے دوچار ہو گی۔ شاخِ نازک پہ آشیانے بنانے والے پرندے بلاشبہ اپنی زندگی کی بربادی کا سامان کرتے ہیں مگر اس بدنصیب طائر کے انجام کا تصور کیجیے جو مضبوط شاخوں پر بنے ہوئے محفوظ نشیمن کو چھوڑ کر محض گرنے کا مزہ چکھنے کے لیے شاخِ نازک پہ آ بیٹھے۔

دوسرے، مسلمانوں کو یہ بات ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھنی چاہیے کہ اخلاق اور مذہب کا چولی دامن کا ساتھ ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ مذہب اخلاق کی تہذیب اور پرورش کے لیے ہی دنیا میں آیا ہے تو یہ زیادہ صحیح

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہو گا۔ یہ سنت اللہ ہے کہ اخلاق سے عاری قوم مذہب کا دامن تھامے نہیں رہ سکتی اور مذہب سے انحراف اخلاقی طاقت کو گھن لگائے بغیر نہیں چھوڑتا۔ جو فرد یا قوم اپنے نفس کی ترغیبات پر کوئی قدغن نہ لگا سکے بلکہ نفس کی غلامی کو ہی اپنی زندگی کا کمال سمجھے وہ دنیا میں زیادہ مدت تک زندہ نہیں رہ سکتی کیونکہ یہ ایک ایسا منفی طرزِ عمل ہے جو انسان کی ساری تعمیری صلاحیتیں سلب کر کے اُسے بالکل مفلوج اور ناکارہ بنا دیتا ہے۔

پھر اس سلسلے میں اس حقیقت کو بھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ آج تک کسی قوم نے بھی فحاشی اور آوارگی سے کسی تہذیب کی تعمیر شروع نہیں کی ہے۔ قومیں سب سے پہلے ایک غلط نقطۂ نظر اپناتی ہیں اور اس کے نتیجے میں اُن کے اخلاق بگڑنے شروع ہوتے ہیں اور پھر وہ اس بگاڑ کو صحیح اور فطرت کے عین مطابق ثابت کرنے کے لیے نئے نئے نظریے گھڑتی رہتی ہیں۔ آپ اگر مغربی قوموں کے حالات کا جائزہ لیں تو آپ کو یہاں بھی یہی اصول کارفرما نظر آئے گا۔ جدید تہذیب نے اپنے سفر کا آغاز اس نعرے سے نہیں کیا تھا کہ آؤ سارے اخلاقی بندھن توڑ کر زندگی بسر کرو۔ اُس نے سب سے پہلے انسان کے ذہن میں یہ بات بٹھائی کہ اس دنیا میں اگر کوئی بات یا عمل اپنی قدر و قیمت رکھتا ہے تو وہ صرف وہی ہے جو تجربے اور مشاہدے میں آسکے، لہٰذا یہ مافوق الطبیعی تصورات محض فریب اور دھوکہ ہیں۔ یہ نظریہ درحقیقت ردِّ عمل تھا اُن اوہام اور خرافات کے خلاف جو پادریوں نے اپنی خدائی قائم کرنے کے لیے گھڑ رکھے تھے۔ اس نظریہ کو جب قبولِ عام نصیب ہُوا تو انسان نے تجربات اور مشاہدات کے ذریعہ انسانی افکار و اعمال کو جانچنا شروع کیا جس سے دو نتائج برآمد ہوئے۔ ایک تو انسان نے فطرت کی چھپی ہوئی قوتوں کا کھوج لگا کر اُن سے فائدہ اٹھانے کے لیے تگ و دو شروع کی اور اس طرح حیرت انگیز علمی اکتشافات اور سائنسی ایجادات میں ترقی ہونے لگی۔ دوسرے انسان نے مذہب کے اُن سارے ضوابط کو توڑنا شروع کر دیا جو اُن کی نظر میں پادریوں کے ساختہ اور ان کے طبائع پر گراں گزرنے والے تھے یا جن کی افادیت مادی پیمانوں سے جانچی نہ جا سکتی تھی۔ پھر جب ایک مرتبہ یہ طے ہو گیا کہ جو قانون اور ضابطہ انسانی فطرت پر بوجھ بنتا ہے یا نفسانی خواہشات کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوتا ہے وہ غلط ہے اور اُسے پس پشت ڈالنے ہی میں انسان کی آزادی کا راز مضمر ہے تو اس کے بعد انسان نے اخلاقی ضابطوں کی پابندی کرنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے بجائے انہیں اپنے میلانات کا پابند بنانا شروع کیا۔ اسی طرح اخلاقی ضابطے انسانوں کے رہنما بننے کے بجائے اُن کی نفسانی خواہشات کے تابع بنائے جانے لگے اور جس رفتار سے معاشرے میں بُرائیوں نے زور پکڑا اسی رفتار کے مطابق ان برائیوں کو صحیح اور جائز ثابت کرنے کے لیے مختلف نظریات گھڑے جانے لگے۔

یہاں ان فلسفوں کی تفصیلات بیان کرنا تو ممکن نہیں ہے۔ ہم صرف چند نظریات کو بطور مثال پیش کرتے ہیں۔ انسان اور حیوان کے اندر جنسی میلان کو فطرت نے بقائے نسل کا ذریعہ بنایا ہے۔ یہ ایک بنیادی حقیقت ہے جس پر تمام لوگ متفق ہیں۔ انسان چونکہ حیوان سے ایک اعلیٰ اور برتر مخلوق ہے اس لیے اس کے اِس میلان کو ایک ضابطے کا پابند بنا کر اس سے معاشرے کی تعمیر کا بھی کام لیا گیا ہے۔ میاں اور بیوی کو صرف اُن کی جنسی خواہشات ہی ایک دوسرے کے قریب نہیں کرتیں بلکہ اُن کی قربت کے پیچھے عائلی زندگی کی تعمیر کا محرک بھی کارفرما ہوتا ہے۔ چنانچہ اس تعلق سے خاندان معرضِ وجود میں آتے ہیں اور ان کی مدد سے نوخیز نسلوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام ہوتا ہے۔ انسان اور حیوان کے جنسی داعیات میں جو فرق ہے وہ فطرت کے اس مقصد کی نہایت کُھلے طور پر غمازی کرتا ہے۔ حیوانوں کے بچے جلد ہی اپنے جنم دینے والوں کو بھول جاتے ہیں مگر انسانوں کی اولاد میں اپنے والدین سے محبت اور آباد اجداد سے وابستگی کا احساس ساری عمر قائم رہتا ہے۔ اسی بنا پر انسان ایک معاشرتی زندگی کی تعمیر کرتا ہے مگر حیوانوں کے اندر اس کا کوئی نام و نشان نہیں ہوتا۔

ایک کامیاب اور پائیدار عائلی زندگی کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ میاں اور بیوی دونوں اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے اپنے آپ پر یہ پابندی عائد کریں کہ ان میں سے کوئی خیانت کا ارتکاب نہ کرے گا اور اس فطری خواہش کو پُورا کرنے کے لیے وہ کسی غیر کی طرف رجوع نہیں کرے گا۔ دوسرے وہ ایک دوسرے کے لیے اور اولاد کے لیے ایثار و قربانی کریں گے۔ یہ پابندیاں اور یہ مطالبات اگرچہ بالکل فطری چیزیں ہیں مگر انسان کا بپھرا ہوا نفس ان سے ابا کرتا ہے اور جب تک ایک محکم ضابطۂ اخلاق اور مضبوط ایمان سرکش نفس کو قابو میں رکھنے کے لیے موجود نہ ہو انسان کا غلط راستوں پر چل نکلنا بالکل فطری امر ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چنانچہ یورپ میں جب لوگوں کا ایمان متزلزل ہونے لگا اور انہوں نے اخلاقی ضابطوں کو محض بیکار کی زنجیریں سمجھ کر انہیں توڑنا شروع کیا تو انسان نے رشتۂ مناکحت، اُس کے تقدس اور اُس کی پابندیوں کو نظرانداز کرتے ہوئے آزاد شہوت رانی کو ہی آزادی کا تقاضا سمجھنا شروع کیا اور انسان نے اپنے اس غلط فعل کے جواز میں یہ دلیل پیش کی کہ جب حیوانوں کو جنسی خواہشات کی تسکین کے لیے ہر قسم کی آزادی ہے تو انسان پر یہ ناروا پابندیاں کیوں عائد کی جائیں۔ اس طرح خلاف وضع فطری طرز عمل کو فطرت کے مطابق ثابت کرنے کی سعی ہونے لگی۔

مذہب کے بچے کھچے اثرات کی وجہ سے ضمیر کی خلش بہر حال موجود تھی جس سے بُرے سے بُرے انسان بسا اوقات اس حالت پر کبیدہ خاطر ہو جاتے۔ اُن کے اس احساس کو زندہ کرنے اور تقویت پہنچانے کے بجائے انہیں یہ سمجھایا جانے لگا کہ یہ احساس تو درحقیقت ایک ذہنی بیماری کی علامت ہے جس سے تمہیں جلد از جلد نجات حاصل کرنی چاہیے۔ خیر و شر کے یہ تصورات محض اعتباری باتیں ہیں، اِن کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہ حالات کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔ انسانی فکر و عمل کا سب سے زبردست محرک صرف جنسی میلان ہے۔ اس پر جس قدر بھی پابندیاں عائد کی جائیں گی وہ ذہنی عوارض پیدا کریں گی۔ لہٰذا تمہیں بغیر کسی احساسِ گناہ کے اس کی تسکین کرنی چاہیے۔ یہ گناہ اور ثواب کی باتیں محض ڈھکوسلے ہیں جو عیار لوگوں نے اپنی مطلب براری کے لیے گھڑ رکھے ہیں۔ انسان کے تو مقدس سے مقدس فعل کی تہ میں بھی سوائے جنس (SEX) کے اور کوئی دوسرا جذبہ کارفرما نہیں ہوتا۔ چنانچہ مذہبی معتقدات اور شعائر، مذہبی رسومات اور عبادات کے ایک ایک جزو کو لے کر یہ تحقیق انیق کی جانے لگی کہ یہ ساری چیزیں انسان کے کن جنسی داعیات کے بگڑے ہوئے عکس ہیں۔ اس تفصیل میں جانے کی ہمت نہیں پڑتی ورنہ یہاں کے باشعور اور حساس لوگوں کو بتایا جائے کہ جس مغربی تہذیب کو تم اپنے لیے موجب خیر سمجھتے ہو اُس نے انسان کے مقدس معتقدات اور پاکیزہ احساسات و انفعال کا کیا حشر کیا ہے۔ جو حضرات اس سلسلے میں معلومات حاصل کرنا چاہیں انہیں فرائڈ اور اُس کے پیروؤں کی پیش کردہ علامات (SYMBOLS) اور ان کی تصریحات پر غور کرنا چاہیے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ تھے یورپ کے وہ فکری رجحانات جنہوں نے اہلِ مغرب کو ہوس کاری کے لیے فکری قوت بہم پہنچائی اور اُس سے جو نتائج برآمد ہوتے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم یہاں صرف امریکہ کے حالات کا سرسری جائزہ پیش کرتے ہیں۔ یہ جائزہ اُن لوگوں کے بیانات پر مشتمل ہے جو اس تہذیب کے علمبردار ہیں اور جنہیں اس پر ابھی تک پُورا پُورا اعتماد ہے۔

امریکہ کے سابق صدر آئزن ہاور اپنے ملک میں جرائم کی روز افزوں ترقی کے اعداد و شمار یہ درج کرتے ہیں:-

۱۹۶۰ء سے لے کر ۱۹۶۵ء تک وہ سنگین جرائم جو پولیس کے نوٹس میں لائے گئے اُن کی تعداد میں ۴۶ فیصد اضافہ ہُوا درآنحالیکہ آبادی صرف آٹھ فیصد بڑھی۔

۱۹۶۵ء میں بیس لاکھ افراد کو جیل بھیجنا پڑا۔

۱۹۶۵ء کے جائزے سے یہ بات معلوم ہوئی کہ سو میں سے ۴۱ افراد کسی شدید جُرم کا شکار ہوئے۔

نوخیز نسلوں میں جُرم کا رجحان بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ چنانچہ ۱۹۶۵ء میں سرقہ خصوصاً کاروں کی چوری میں جو لوگ ماخوذ ہوتے ان میں سے آدھی تعداد گیارہ سے سترہ سال کے بچّوں کی تھی۔

یہ اعداد و شمار بیان کرنے کے بعد مسٹر آئزن ہاور لکھتے ہیں:

"اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم مجرموں کی قوم بن گئے ہیں۔ مگر یہ بات ضرور ہے کہ قانون اور نظم و نسق کے معاملے میں ہمارے اندازِ فکر میں کوئی سنگین خرابی پیدا ہو گئی ہے۔"

یہ اعداد و شمار یا آئزن ہاور صاحب کا یہ اضطراب اتنا اہم نہیں جتنا اہم اُس غلط اندازِ فکر کا وہ تجزیہ ہے جو جرائم کو جنم دیتا ہے۔ انہوں نے ایک فاضل ایڈگر ہوور کے یہ الفاظ نقل کیے:

"ہمارے لیے پریشان کُن مسئلہ یہ ہے کہ ہم اُن اسباب کا کھوج لگائیں جن کی وجہ سے ہمارے نوجوانوں کا اخلاق بگڑ رہا ہے۔ مجھے اس بات کا پُورا یقین ہو گیا ہے کہ اس معاملے میں سب سے زیادہ مہلک اور نقصان دہ چیز وہ غلط تعلیم ہے جو انسان کی ناکامیوں، نامرادیوں اور تکلیفات کی ساری ذمہ داری معاشرے پر ڈالتی ہے۔ نوجوان اور اُن کے والدین اِسی باطل نظریے میں گرفتار نظر آتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چنانچہ اس کے اثر کے تحت وہ ہر قسم کے باغیانہ طرزِ عمل سے، خواہ وہ حکام کے خلاف ہو یا انسان کی نفسانی خواہشات و ترغیبات اور سرگرمیوں کے خلاف، چشم پوشی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ غلط نظریہ ہمارے مدارس، ہمارے گھروں، ہماری عدالتوں اور ہمارے گلی کوچوں میں پھیل گیا ہے"۔

اسی بات کو مختصر طور پر یوں کہا جا سکتا ہے کہ انسان کی داخلی تہذیب اور اس کے داخلی محرکات اور میلانات کے نظم و ضبط کا کوئی انتظام باقی نہیں رہا۔ مغرب کے سائنسی کمالات نے چونکہ انسان کی خارجی زندگی میں بے شمار تغیرات پیدا کر دیے ہیں اس لیے وہ غلطی سے یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ انسانی زندگی میں فیصلہ کن اہمیت، صرف خارجی حالات کو حاصل ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص بُرائی کا ارتکاب کرتا ہے تو درحقیقت وہ مجرم نہیں بلکہ وہ معاشرہ مجرم ہے جس نے اس کے لیے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ وہ بُرائی کا مرتکب ہو۔ یہ نظریہ سراسر غلط اور باطل نہیں۔ اس میں ایک حد تک صداقت کا پہلو بھی موجود ہے۔ خارجی حالات بلاشبہ انسان کے فطری داعیات پر اثر انداز ہوتے ہیں اور انسانی سیرت کی تشکیل میں اچھی خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ مگر مغرب کے دوسرے نظریات کی طرح یہ نظریہ بھی چونکہ مذہبی تعلیمات کے بے وزن بنانے کے لیے پروان چڑھا ہے اس لیے اس میں توازن ناپید ہے۔ انسان خارجی حالات کے ہاتھوں اس طرح بے بس نہیں ہوتا جس طرح مشین کے پُرزے مشین میں بے بس ہوتے ہیں۔ اس لیے کسی بُرائی کی پوری ذمہ داری خارجی حالات پر ڈال کر خود معصوم بن بیٹھنا ایک غلط اندازِ فکر ہے۔ اسی غیر متوازن نقطۂ نظر نے مغرب کے اندر جرائم کی غیر معمولی حوصلہ افزائی کی ہے۔ جب لوگ خصوصاً نوجوان اخلاق اور شرافت کی ساری حدود توڑ کر آوارگی اور انتشار پر اتر آتے ہیں تو اس تشویش ناک صورتِ حال کی سنگینی کو کم کرنے کے لیے یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ سارا قصور معاشرتی اور معاشی حالات کا ہے جنہوں نے ان جرائم کو جنم دیا ہے۔

اسی طرزِ فکر کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک طرف تو جرائم کی رفتار میں بے پناہ اضافہ ہو رہا ہے اور دوسرے ان کی طرف سے عام لاپروائی کار فرما نظر آتی ہے اور ان کے تدارک کی کوئی فکر نہیں کی جاتی۔ اس سلسلے میں اگر کچھ کیا بھی جاتا ہے تو وہ اعداد و شمار جمع کرنے، ان کے تجزیے کرنے اور ان کے بارے میں مختلف رپورٹیں مرتب کرنے سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ معاشرتی اور معاشی تبدیلیاں محض ان رپورٹوں کی اشاعت سے تو نہیں ہو جاتیں، ان کے لیے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انقلابی ذہن اور مضبوط حوصلے اور تعمیری عمل کی ضرورت ہوتی ہے جو ایک فاسد نظام کو بدل کر اس کی جگہ کوئی صالح نظام لاسکے۔ اور اس قسم کے ذہن اور عزم رکھنے والے افراد اچھی طرح جانتے ہیں کہ جزوی تغیرات سے کبھی کسی نظام کا ڈھانچہ نہیں بدلا جاسکتا۔ دنیا کے ہر نظام کے ارد گرد مفاد پرستوں کا ایسا تانا بانا بنا ہوا ہوتا ہے کہ وہ تبدیلی کے احساس کو پیدا ہی نہیں ہونے دیتے اور اگر پیدا بھی ہو جائے تو اُسے عملی زندگی میں بروئے کار نہیں آنے دیتے۔

امریکہ، برطانیہ اور فرانس میں اباحت مطلقہ اور نوجوان نسل کی بے راہ روی پر سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں رپورٹیں شائع ہو چکی ہیں مگر ان کے مطابق کوئی مثبت قدم نہیں اٹھایا گیا۔ بلکہ جب کبھی قوم نے تشویش کا اظہار کیا تو ان جرائم کے جواز کے لیے مختلف قسم کی توجیہات پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ یہ سب حالات کا فطری اقتضا ہے، اس لیے اس پر اتنا برانگیختہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔

پھر بہت کم لوگ ایسے ہیں جنہوں نے فساد کی اصل جڑ کی ٹھیک ٹھیک نشاندھی کی ہے۔ بعض لوگ تو غالباً مرض کی تشخیص میں ناکام رہے ہیں مگر بعض کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے جان بوجھ کر اس سے اغماض برتا ہے۔ معاشرے کے ساتھ انسان کا تعلق پروفیسر ٹائن بی کے بقول اس طرح کا نہیں ہوتا جیسا چیونٹوں کا درخت سے ہوتا ہے۔ بلاشبہ وہ معاشرے کا فرد ہونے کی وجہ سے اس کی اچھائیاں اور برائیاں کسی حد تک قبول کرنے پر مجبور ہوتا ہے، مگر وہ مجبور محض نہیں ہوتا کہ معاشرہ جس رنگ میں اُسے رنگنا چاہے آسانی کے ساتھ پوری طرح رنگ دے۔ اس میں وقت کے غالب رجحانات کے خلاف سوچنے کی قوت اور حالات کے دھارے کے خلاف جدوجہد کرنے کا حوصلہ بھی ہوتا ہے۔ مگر اس کی اس قوتِ فکر و عمل کا منبع اُس کا اپنا ضمیر، اس کا اپنا وجدان، اس کا اپنا ذہنی سانچہ، غرض اس کی داخلی دنیا ہے۔ جب تک اس دنیا میں تبدیلی کی امنگ اور احساس پیدا نہ ہو وہ خارجی دنیا میں کوئی انقلابی قدم نہیں اٹھا سکتا۔ ظاہر بات ہے کہ جب تک افکار و جذبات کی صحیح انداز پر تربیت کر کے ان میں نیکی اور پاکیزگی پیدا نہیں کی جاتی۔ انسان خارجی دنیا میں کسی پاکیزگی اور بھلائی کا علمبردار بن کر نہیں اٹھ سکتا۔ دل کی اس داخلی دنیا کی ہمیشہ مذہب اور اُس کی تعلیمات نے تہذیب کی ہے۔ مگر بدقسمتی سے دورِ حاضر کا انسان آج مذہب ہی سے سب سے زیادہ بیگانہ اور بے تعلق ہے۔ وہ اسے اپنا کر اپنی بے قید عیش پرستیوں پر کوئی پابندی لگانا گوارا نہیں کرتا یہی وجہ ہے کہ وہ جنسی

© rasailojaraid.com

انارکی کے ہر لحظہ بڑھتے ہوئے طوفان کی تباہ کاریوں کو محسوس کرنے کے باوجود اُس کے تدارک کے لیے کوئی موثر قدم نہیں اٹھا سکا اور اپنی ساری توجہ اُن چیزوں پر صرف کر رہا ہے جو فساد کے مراکز نہیں بلکہ اُس کی محض علامات ہیں۔

امریکہ اس وقت دنیا کا امیر ترین ملک ہے۔ وہاں کے باشندوں کا معیارِ زندگی مشرقی ممالک سے پندرہ سے بیس گنا زیادہ ہے۔ دولت کی ریل پیل ہے۔ راحت اور آرام کے سامانوں کی کثرت ہے۔ ملک کی انتظامی مشنیری اور عدلیہ کو انتظام و انصرام اور انصاف کے لیے جو زیادہ سے زیادہ سہولتیں میسّر ہو سکتی ہیں وہ انہیں حاصل ہیں۔ مگر اس ساری خوشحالی و ترقی کے باوجود آج وہاں اخلاقی انحطاط نے جو صورت اختیار کر رکھی ہے اُسے پڑھ کر انسان کا ضمیر لرز اُٹھتا ہے اور سوچتا ہے کہ اُن لوگوں کا تجربہ کتنا غلط ہے جو زندگی کے سارے مسائل کو دولت کے ذریعہ حل کرنے کا داعیہ رکھتے ہیں۔ اس وقت ہمارے سامنے ڈاکٹر لی لینڈ گلوور کی وہ رپورٹ ہے جو اُس نے تیرہ اور انیس سال کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی جنسی زندگی کے بارے میں پیش کی ہے۔ رپورٹ کے فاضل مرتب کے جائزے کے مطابق اس عمر کے نوجوانوں میں حرام کاری جس تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے اُس کا نتیجہ یہ نکلتا نظر آتا ہے کہ سنہ ۱۹۷۷ء تک امریکہ کا ہر ساتواں بچہ حرامی ہوگا اور اس صدی کے اختتام تک ہر پانچواں بچہ عورت اور مرد کے ناجائز تعلق کا نتیجہ ہوگا۔[1]

ایک دوسرے مقام پر یہی ڈاکٹر لکھتا ہے:

"شادی سے پہلے مرد اور عورت کے درمیان جنسی روابط کا ہونا بالکل معمول بن کر رہ گیا ہے اور اس حرام کاری سے جو بچے جنم لیتے ہیں۔ معاشرہ انہیں جائز اولاد کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ سترہ سال کے قریب عمر کی غیر شادی شدہ لڑکیوں کے ہاں سنہ ۱۹۵۷ء میں ۴۴ ہزار ناجائز بچے پیدا ہوئے۔"

مسٹر گلوور نے ایک ایسے ادارے کی نگراں خاتون سے انٹرویو لیا ہے جو ناجائز بچوں کی دیکھ بھال کے لیے بنایا گیا ہے۔ اس خاتون کی تصریحات لائقِ غور ہیں۔ اس نے مصنف کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا:

"ہمارے ہاں زیادہ تر بیس سال سے کم عمر کی لڑکیاں آتی ہیں۔ گذشتہ سال ایک سو ستتالیس

---

[1] SEX LIFE OF THE MODERN TEEN AGERS P. 125

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لڑکیوں نے ناجائز بچے جننے کے لیے ہمارے اس ادارے کی طرف رجوع کیا۔ ان میں بیشتر ہائی سکول اور جونیئر سکول کی بچیاں تھیں۔ ۔ ۔ ۔ سب سے چھوٹی غیر شادی شدہ ماں کوئی بارہ برس کی ہوگی۔" صـ۱۲۹

فاضل مصنف نے اسقاطِ حمل کے واقعات کا بھی جائزہ پیش کیا ہے۔ اس کا خیال یہ ہے کہ اصل واقعات اُس کے اندازے سے کہیں زیادہ ہیں کیونکہ آج بھی اسے ناپسندیدہ حرکت سمجھ کر اس فعل کو چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مگر ان ساری احتیاطی تدابیر کے باوجود جو حالات سامنے آتے ہیں وہ انتہائی گھناؤنے ہیں۔ اس ترقی یافتہ ملک میں دو لاکھ سے ۱۲ لاکھ تک حمل ہر سال گرائے جاتے ہیں۔ جو عورتیں اس جُرم کا ارتکاب کرتی ہیں ان کا قریب قریب ساتواں حصہ سکول اور کالج کی طالبات پر مشتمل ہے۔

امریکہ کے ہفت روزہ "ٹائم" نے بتایا ہے کہ گذشتہ پندرہ سالوں کے اندر کالج اور سکول میں تعلیم حاصل کرنے والی نوخیز نسلوں میں زناکاری کا رجحان خطرناک حد تک بڑھا ہے اور طلباء کے مقابلے میں طالبات کا اخلاق کہیں زیادہ تیزی سے بگڑا ہے۔ ٹائم کے جائزے کے مطابق فارغ التحصیل ہونے سے پیشتر جو لڑکے اس جُرم کے مرتکب ہوتے ہیں اُن کی تعداد ۵۰ فی صد سے بڑھ کر ۶۰ فیصد ہوگئی ہے، مگر اس کے مقابلے میں لڑکیوں کے اندر یہ تناسب ۲۵ فیصد سے بڑھ کر چالیس فیصد تک پہنچ گیا ہے۔ اب سکول اور کالج اخلاقی تربیت کے ادارے نہیں رہے بلکہ فحاشی کے اڈے بن گئے ہیں جہاں تعلیم تو کم حاصل کی جاتی ہے اور اخلاق زیادہ بگڑتا ہے۔ ٹائم کے قول کے مطابق گزشتہ نسل کے نوجوان کو حرام کاری کے لیے کالج سے باہر جانا پڑتا تھا۔ مگر آج اپنی اس ہوس کو کالج کے اندر ہی پورا کرنے میں اگر وہ ناکام رہ جائے تو دوستوں کی نظروں میں ہدفِ ملامت بنتا ہے۔ مقالہ نگار لکھتا ہے:

"بہت سی لڑکیاں اب بھی اپنے اخلاق کو تباہ کرنا نہیں چاہتیں اور عفت و عصمت کے آبگینوں کو بچا کر رکھنے کی آرزومند ہیں۔ مگر اس صورتِ حال کا تادیر قائم رہنا اب قریب قریب ناممکن بنتا جا رہا ہے۔ ان پر اخلاقی بے راہروی کے لیے صرف لڑکوں کی طرف ہی سے دباؤ نہیں پڑتا بلکہ اُن کی ہمجولیوں کی طرف سے بھی انہیں ترغیب دی جاتی ہے۔ عفت کی بربادی، خواہ اس کے نتیجہ میں حمل بھی ہو جائے تو اب امریکہ میں وہ کوئی المیہ تصور نہیں کیا جاتا۔ کنوارے پن کے اب معنی ہی بدل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گئے ہیں۔ اگر ایک لڑکی اپنے ہونے والے خاوند یا اس طرح کے ایک دو اور نوجوانوں سے شادی سے قبل ہی جنسی تعلق پیدا کرلے تو اسے کنواری ہی سمجھا جاتا ہے۔"

آگے چل کر مقالہ نگار لکھتا ہے کہ اس اباحت کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ نوجوانوں کو ہر وقت یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ جنسی تعلق کو خواہ مخواہ معاشرہ ایک گناہ سمجھتا ہے۔ اس میں گناہ کی کوئی بات نہیں۔ یہ تو ایک فطری عمل ہے۔ ہاں یہ گناہ اس وقت بن جاتا ہے جب اس کے بارے میں گناہ ہونے کا احساس پیدا کر دیا جائے چنانچہ امریکہ کے بہت سے دانشوروں کا خیال ہے کہ اگر مرد اور عورت کے ناجائز تعلقات کو اخلاقی آلودگی نہ سمجھا جائے تو اس سے عائلی نظام کے پھر سے مستحکم ہو جانے کی توقع کی جا سکتی ہے، کیونکہ اس صورت میں خاوند اپنی بیوی کی اخلاقی بے راہروی کی وجہ سے بددل ہو کر اس سے علیحدگی اختیار نہ کرے گا بلکہ اس کی آبرو باختگی کو جانتے ہوئے بھی خوشدلی کے ساتھ اس سے رشتہ مناکحت قائم رکھے گا اور اس طرح خاندان منتشر اور تباہ ہونے سے بچ جائیں گے۔

اس موضوع پر بہت سے مفکرین نے اظہار خیال کیا ہے اور الفاظ کے اختلاف کے باوجود وہ اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ اہل مغرب کو اب اباحت مطلقہ کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے نہ دیکھنا چاہیے جب معاشرہ اس راہ پر چل ہی نکلا ہے تو اب اسے ایک برائی کی حیثیت سے نہیں بلکہ اچھائی اور بھلائی کی حیثیت سے قبول کر لینا چاہیے۔ کیونکہ اس کے بعد بھی اگر اس کے اندر گناہ کا تصور موجود رہا تو یہ چیز لوگوں کے ضمیر پر بوجھ ہوگی اور اس طرح ان کے دلوں میں اس کے بارے میں ایک خلش باقی رہے گی اور وہ کبھی دلی اطمینان کے ساتھ زندگی بسر نہ کر سکیں گے۔

ہفت روزہ نیوز ویک نے اپنی ایک حالیہ اشاعت میں امریکہ کی اخلاقی صورتِ حال پر ایک مقالہ شائع کیا ہے۔ اس کا تجزیہ بھی قریب قریب وہی ہے جو ٹائم کے مقالہ نگار اور اس موضوع پر اظہار خیال کرنے والے دوسرے مصنفین کا ہے۔ ان سب کا مطالعہ کرنے کے بعد انسان محسوس کرتا ہے کہ دنیا اس وقت ایک عجیب چکر میں گرفتار ہے اور اسے اس سے نجات کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ جب نوجوان اپنے سفلی جذبات کی بے قید

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تسکین کے لیے اخلاقی ضابطوں اور پابندیوں کو توڑتے ہیں تو مغرب کے ملحد مفکرین اُن کے اس باغیانہ طرزِ عمل پر بڑے خوش ہوتے ہیں اور ان کی تائید میں بڑے بڑے مقالے لکھتے ہیں کیونکہ اُن کی یہ روش مذہب سے بغاوت کا رجحان ظاہر کرتی ہے اور یہ لوگ اس خیال سے پھولے نہیں سماتے کہ انسانی زندگی میں مذہب ایک غیر مؤثر قوت بنتا نظر آرہا ہے۔ چنانچہ یہ مفکرین اُن کی حمایت کے لیے اور اُن کے غیر ذمہ دارانہ طرزِ عمل کو صحیح ثابت کرنے کے لیے عجیب و غریب نظریات گھڑتے ہیں۔ مثلاً یہ فلسفہ پیش کیا جاتا ہے کہ مذہب نے خواہ مخواہ انسان کے فطری داعیات پر پابندیاں عائد کر رکھی ہیں اور انہیں توڑے بغیر انسان کا کبھی صحیح اور صحت مندانہ نشوونما نہیں ہو سکتا، اس بنا پر یہ لوگ اخلاقی حدود و قیود کو توڑ کر ایک نہایت مستحسن قدم اٹھا رہے ہیں۔

ان دانشوروں کے سوچنے کا نہج کیا ہے اس کا اندازہ ان مضامین سے لگایا جاسکتا ہے جو چند سالوں میں عملِ قومِ لُوط کی حمایت میں لکھے گئے ہیں۔ مثلاً یہ کہا گیا کہ مذہب کے یہ علمبردار آخر اس فعل کو کس طرح غیر فطری کہہ سکتے ہیں جبکہ انسان شروع ہی سے اس کا ارتکاب کرتا چلا آیا ہے یعنی بُرائی آغاز ہی سے انسان کے ساتھ لگی ہوئی ہے اُسے آخر بُرائی کس طرح کہا جا سکتا ہے؟ لہٰذا یہ فعل فطرت کے عین مطابق ہے۔ کبھی یہ کہا جاتا کہ معاشرے کو آخر اس بات کا کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ لوگوں کے نجی معاملات میں دخل دے؟ اگر دو افراد اس طرح جنسی تسکین کرنے کے حق میں ہیں تو انہیں آزادی ہونی چاہیے۔ کبھی یہ دلیل دی جاتی کہ ایک ہی جنس سے تعلق رکھنے والے دو افراد کے درمیان جنسی تعلق اُلفت و محبت کے زیادہ بہتر رشتے استوار کرتا ہے۔ اس میں اگر قباحت کا کوئی پہلو ہو سکتا ہے تو صرف یہی کہ فعل کا ارتکاب ایسی حالت میں کیا جائے جب کہ ایک فریق اس پر رضامند نہ ہو۔ اگر یہ جرم ہے تو صرف اسی صورت میں کہ اس کا بغیر رضامندی کے ارتکاب کیا جائے۔

اس قبیح فعل کے حق میں صرف غلط سلط دلائل ہی پیش نہیں کیے گئے بلکہ جو لوگ ان کے مرتکب ہوتے ہیں ان کے لیے عوام کا جذبۂ ہمدردی بھی اُبھارنے کی کوشش کی گئی اور یہ کہا گیا کہ یہ لوگ مجرم نہیں بلکہ مظلوم لوگ ہیں۔ انہیں والد اور والدہ کی محبت نہیں ملتی اس لیے وہ اس کی تلاش میں غلط راہ پر پڑ جاتے ہیں۔ گھر لیے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اُلجھنیں انہیں پریشان کرتی ہیں اور وہ بے چارے مضطرب ہو کر اس طریق سے اپنے لیے سکون کا سامان کرتے ہیں۔ اس بنا پر یہ لوگ نفرت کے مستحق نہیں بلکہ ہمدردی کے مستحق ہیں اور معاشرے کو ان کے ساتھ بڑا ہمدردانہ برتاؤ کرنا چاہیے۔

معاملہ یہیں تک محدود نہ رہا بلکہ اس فعل کے عادی مجرموں میں سے جن چند لوگوں نے بھی کوئی علمی اور ادبی کام کیے تھے ان کی مدح سرائی میں بڑی بڑی کتابیں تصنیف کی گئیں اور اس طرح لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال راسخ کیا گیا کہ اس جُرم کا ارتکاب وہ لوگ کرتے ہیں جو غیر معمولی طور پر ذہین ہوتے ہیں اور اس اخلاقی بے راہروی کا اُن کی فکری صلاحیتوں پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑتا، بلکہ اس سے اُن میں نکھار آتا ہے۔

جب فکری اعتبار سے اس فعل کے جواز کے لیے لوگوں کے ذہنوں کو تیار کر لیا گیا، جب اُن کے جذبات سے اپیل کر کے ان کے لیے ہمدردی کی فضا قائم ہو گئی، اور جب عملی طور پر یہ ثابت کر دیا گیا کہ اس فعل سے انسان کے دل و دماغ پر کوئی بُرے اثرات مترتب نہیں ہوتے تو اس کے بعد قانونی طور پر اس کا جائز قرار پا جانا کچھ مشکل نہ تھا۔ چنانچہ یورپ کے کئی ایک ممالک میں یہ جُرم قانونی لحاظ سے بھی کوئی جرم نہیں رہا بلکہ ایک جائز فعل بن گیا ہے، حتیٰ کہ ہالینڈ میں یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ ایک گرجا میں فاعل و مفعول کا نکاح باقاعدہ پڑھا گیا اور ایک پادری صاحب نے یہ خدمت انجام دی۔

یہ ہے وہ اندازِ فکر جس کے مطابق مغربی قوموں نے اخلاقی بے راہروی کو اپنا شعار بنایا ہے۔ مگر جب اس کے عملی نتائج سامنے آتے ہیں، جب اس اباحتِ مطلقہ سے ان کے گھر برباد ہوتے ہیں، اُن کی اجتماعی زندگی متاثر ہوتی ہے اور ان کے اندر مجرموں اور باغیوں کی تعداد بڑھتی ہے تو پھر وہ جائزے لینے کے لیے کمیٹیاں مقرر کرنی شروع کرتی ہیں، یا پھر اپنے اوپر ایک نہایت ہی سخت اور متشدّد نظام کو دعوت دیتی ہیں جو قوّت کے زور سے ان کے اندر نظم و ضبط پیدا کرے۔

کسی فرد یا قوم کی ذہنی اور عملی آوارگی تو ایک طوفان ہے۔ وہ جب اُٹھتا ہے تو پھر مذہب، اخلاق، تہذیب، تمدن، معاشرت سب کو برباد کر کے چھوڑتا ہے۔ یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ وہ صرف مذہب کی بندشوں سے ہی انسان کو آزاد کر کے رہ جائے گا۔

© rasailojaraid.com